Dareecha-e-Tahqeeq
دریچۂ تحقیق
ISSN PRINT 2958-0005 ISSN Online 2790-9972
VOL 7, Issue 3
www.dareechaetahqeeq.com dareecha.tahqeeq@gmail.com
Research Article

افراء مشتاق
ایم فل سکالر، مائی یونیورسٹی، اسلام آباد۔
ڈاکٹر مستنصر حسین جامی
اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ اردو، مائی یونیورسٹی، اسلام آباد۔

اردو ادب پر تراجم کے اثرات

Ifra Mushtaq
MPhil (Urdu) Scholar, Department of Urdu, MY University, Islamabad
Dr. Mustansar Hussain Jami
Assistant Prof. Department of Urdu, MY University, Islamabad

The Impact Of Translation On Urdu Literature

Translation is a very effective means of human civilization evolution, intellectual exchange and literary contacts. It has played a fundamental and important role in introducing different nations and the languages spoken between them and their cultures to each other. Translation is no longer just a process of transferring of words from one language to another, but in linguistic terms, today it is considered a complex and creative art of transferring different thoughts and feelings, cultural values and literary aesthetics. This is why translation has not only proven to be a cultural dialogue in every era but also a guarantee of intellectual broad mindedness and literary evaluation. A review of the history of Urdu literature reveals that translations have played an extraordinary role in the formation and development of Urdu literature. Translation from Arabic, Persian , Sanskrit, English, Turkish, Russian and other languages and literature have also enriched in Urdu literature with many new ideas, new literary genres, modern literary styles and diverse vocabulary. Due to these translations, Urdu literature established a relationship with a world literary tradition, which became a means of expanding its creative dimensions. Translation not only expanded the scope of expression of the Urdu language but also brought about significant changes in the intellectual perspective of writers and poets. When many world literary masterpieces were translated into Urdu their impact was not limited to the promotion and dissemination of the language and refinement of its tone and politeness, but these translations also left an equal and profound impression on Urdu poetry, Ghazal, fiction, novel and the art of criticism.

Key Word: Translation, Intellectual, Fundamental, Linguistic, Urdu Literature**,** Creative Dimensions, Diverse Vocabulary, Intellectual Perspective

ترجمہ انسانی تہذیب کے ارتقاء، علمی تبادلہ خیال اور ادبی روابط کا بے حد موثر ذریعہ ہے۔ جس نے مختلف اقوام اور ان کے مابین بولی جانے والی زبانوں اور ان کی ثقافتوں کو ایک دوسرے سے متعارف کرانے میں بنیادی اور اہم کردار ادا کیا ہے۔ ترجمہ محض ایک زبان کے الفاظ کو دوسری زبانوں میں منتقل کرنے کا عمل نہیں رہا، بلکہ لسانی لحاظ سے آج یہ مختلف افکار واحساسات، تہذیبی اقدار اور ادبی جمالیات کی منتقلی کا ایک پیچیدہ اور تخلیقی فن سمجھا اور گردانا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ترجمہ ہر دور میں نہ صرف تہذیبی مکالمہ ثابت ہوتا رہا ہے، بلکہ فکری وسیع النظری اور ادبی ارتقاء کا ضامن بھی رہا ہے۔ اردو ادب کی تاریخ پر نظر ثانی سے یہ پتا چلتا ہے کہ اردو ادب کی تشکیل وترقی میں تراجم نے غیر معمولی کردار ادا کیا ہے۔ عربی، فارسی، سنسکرت، انگریزی، ترکی روسی اور دیگر زبان وادب سے ہونے والے ترجموں نے اردو ادب کو کئی نئے خیالات، نئی ادبی اصناف، جدید ادبی اسالیب اور متنوع لفظیات سے ہم آہنگ اور مالا مال بھی کیا ہے۔ انھی تراجم کی بدولت اردو ادب نے عالمی ادبی روایت سے رشتہ استوار کیا، جو اس کی تخلیقی جہات کو وسعت بخشنے کا وسیلہ بنیں۔ ترجمے سے نہ صرف اردو زبان کے دائرہ اظہار کو وسعت عطا ہوئی بلکہ ادباء وشعراء کے فکری زاویوں میں

بھی نمایاں تبدیلیاں پیدا ہوئیں۔ متعدد عالمی ادبی شہ پارے جب اردو میں ترجمہ ہوئے تو ان کے اثرات صرف زبان کی ترویج و اشاعت اور اس کے لہجہ کی ادائیگی و شائستگی تک محدود نہ رہی بلکہ ان تراجم نے اردو نظم غزل، افسانہ، ناول ڈراما اور تنقید کے فن کی تشکیل پر بھی یکساں اور گہرے نقوش مرتب کیے۔

1۔ ترجمہ: مفہوم، ضرورت اور اہمیت

ترجمہ مختلف زبانوں کے درمیان محض الفاظ کی تبدیلی کا نام نہیں ہے، بلکہ ایک زبان کے افکار، مفاہیم، احساسات، تہذیبی تجربات اور ادبی جمالیات کو مختلف زبانوں میں منتقل کرنے کا تخلیقی عمل بھی ہے۔ اس سلسلے میں رومن جیکوبسن کیا کہتے ہیں:

" رومن جیکوبسن نے ترجمے کو لسانی تعبیر کے ایک وسیع عمل کے طور پر دیکھا اور بین اللسانی ترجمے کو ایک زبان کے زبانی اظہاریہ کی دوسری زبان کے اظہاریہ سے تعبیر قرار دیا ہے۔" (1)

اس تصور سے واضح ہوتا ہے کہ ترجمہ صرف لفظی مطابقت کا مسئلہ نہیں بلکہ معنی کی منتقلی اور تعبیرِ نو کا عمل بھی ہے۔ ترجمہ کا مفہوم ڈاکٹر فاخرہ نورین اپنی تصنیف ترجمہ کاری میں ان الفاظ میں بیان کرتی ہیں:

" ترجمہ نہایت پیچیدہ تخلیقی عمل ہے۔ ترجمے کی یہ تعریف یقیناً اس کی قدیم تعریفوں کے منافی ہے کیونکہ ترجمے کو محض نقالی اور مفہوم کی ایک سے دوسری زبان میں منتقلی قرار دیا جاتا رہا ہے۔ ذہنی مزدوری اور میکانکی عمل سمجھا جانے والا فن پیچیدہ تخلیقی عمل تو درکنار تخلیقی عمل سے بھی کوسوں دور خیال کیا جاتا رہا ہے۔" (2)

آج ادبی دنیا میں تراجم کی اہمیت و افادیت دوچند ہو چکی ہے۔ بلکہ ترجمہ موجودہ دور میں مختلف زبانوں کی اصل ضرورت بن چکا ہے۔ یہ تراجم کسی بھی زبان کے پھلنے پھولنے کا سبب تو بنتے ہی ہیں۔ مگر اس کے ساتھ ہی یہ الفاظ و زبان کی نشو و نما اور انسانی علوم میں اضافے کا ذریعہ و موجب بھی بن جاتے ہیں، یہی تراجم انسانی ذہنی سرحدوں کو کشائش و آسودگی بخشتے ہیں۔ زبان کی سطح پر یہ تراجم خیالات و جذبات کی ہر سمت کو اپنے اندر سمونے کی خاطر نت نئے طریقے بھی رائج اور متعارف کرواتے ہیں۔ تراجم عملی سطح پر دو زبانوں اور دو تہذیبوں کے درمیان ایک مضبوط ستون ثابت ہوتے ہیں۔ علاوہ ازیں ترجمہ دراصل دو زبانوں کے درمیان محض الفاظ کی تبدیلی کا نام نہیں، بلکہ ایک زبان کے افکار، مفاہیم، احساسات، تہذیبی تجربات اور ادبی جمالیات کو دوسری زبان میں منتقل کرنے کا تخلیقی عمل ہے۔ ترجمہ اور بالخصوص شاعری کے ترجمہ کی ضرورت و اہمیت پر خلیق انجم کی رائے بے حد معنی خیز ہے:

" ترجمہ ناممکن ہے۔ لیکن اس کے بغیر کام بھی نہیں چل سکتا۔ اگر یہ فن نہ ہوتا تو یقیناً آج ہمارا علم بہت محدود ہوتا۔ انسانی یادداشت کو محفوظ رکھنے میں ترجموں کو بہت عمل دخل ہے، اگر روم بغداد اور اسپین میں بہت بڑے پیمانے پر ترجمے نہ کیے جاتے تو آج فکر انسانی کی بہت ہی کڑیاں گم ہوتیں۔ اردو میں بوطیقا کا جو ترجمہ ہے وہ انگریزی سے لیا گیا لیا لیا ہے۔ انگریزی میں اطالوی سے اور اطالوی میں عربی سے کیا گیا ہے عربی میں سریانی سے اور سریانی سے اصل زبان یعنی یونانی سے کیا گیا ہے ارسطو کی اس تصنیف کا سلسلہ اس وقت شروع ہوا تھا جب کرۂ ارض بہت وسیع تھا آمد و رفت کے ذرائع محدود تھے، وائرلیس اور ریڈیو جیسی ایجادوں کا تصور بھی نہیں تھا۔ مشینی ایجادوں نے فاصلے کم سے کم کر دیئے ہیں۔ اس دنیا سمٹ کر ایک ایسا بڑا شہر بن گئی ہے جس میں مختلف زبانیں بولنے والے لوگ رہتے ہیں، سائنس دان نے دان نے انسانوں کو ایک دوسرے کے قریب کیا ہے۔ اور مترجم نے انسانی ذہن کو۔۔۔۔ اب صرف اعلیٰ تصنیفات کا ہی نہیں بلکہ معمولی سی معمولی کتابوں، مضمونوں اور خبروں کا ترجمہ بھی ضروری ہے ہر فن کے ترجمے کے مسائل الگ الگ ہیں۔ نظم کے مقابلے میں نثر کا ترجمہ نسبتاً آسان ہے نثر میں افسانے اور ناول کا ترجمہ ٹیکنکل کتابوں کے مقابلے میں آسان ہے سب سے زیادہ مشکل اور بعض اوقات تو ناممکن حد تک مشکل کام نظم کا ترجمہ ہے جس کے لیے ڈاکٹر جانسن نے بہت سیدھے سادے اور مختصر الفاظ میں کہا تھا نظم کا ترجمہ تو جناب ہو ہی نہیں سکتا۔ اور وارٹر ہیوگو نے فیصلہ سنایا تھا۔ نظم کے ترجمے کا خیال ہی بے معنی اور ناممکن ہے۔ لیکن اس کے باوجود مغرب کے بعض صف اول کے ادیبوں اور شاعروں نے اس بے معنی اور ناممکن فن کی طرف توجہ کی ہے۔"(3)

خلیق انجم صاحب کی اس بات میں کوئی دو رائے نہیں کیونکہ آج ترجمہ ہی کی بدولت علم و ادب کے بیش بہا خزانوں تک ہماری رسائی ممکن ہو پائی ہے۔ اگر نظمیں یا شاعری ترجمہ نہ کی جاتیں۔ تو یہ قوی امکان تھا کہ ہم مختلف زبانوں کے ادب اور اس کے ایک اہم گوشے سے محروم رہ جاتے۔ یوں اردو زبان میں جو وسعت ہم آج دیکھ رہے ہیں غالباً دیکھنے سے قاصر رہ جاتے۔ مختلف ادبیات کا ترجمہ ہونا بذات خود ایک اچھی اور نفع بخش بات سمجھی جاتی ہے۔ ایک زبان سے دوسری زبان میں ترجمہ کرنے کا عمل گویا دونوں تہذیبوں کو کھینچ کر قریب لانے کا عمل ہے۔ ترجمہ کا دوسرا رخ دراصل اپنے آپ کو دوسری تہذیب میں جذب کرنے کا عمل بھی کہلاتا ہے۔ اس بابت ڈاکٹر حیات افتخار فرماتے ہیں:

"ادب اور سائنس میں ترجموں کا سب سے بڑا جواز یہی ہے کہ علم کسی خاص طبقہ کی میراث نہیں ہے آج ایک سائنسی نظریہ اختراع کیا جاتا ہے تو وہ آن کی آن میں دنیا کے ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک پہنچ جاتا ہے لیکن اس کے برخلاف ادبی میراث کو منتقل ہونے میں ایک عرصہ لگ جاتا ہے خاص طور پر اردو میں اس کی رفتار بہت ہی دھیمی ہے شاید اسی احساس کے پیش نظر ہمارے ممتاز شاعر قاضی سلیم نے یہاں تک کہہ دیا تھا کہ ہمارے تمام تخلیقی فنکاروں کو چاہیے کہ وہ تھوڑے سے عرصے کے لیے تخلیقی کام سے منہ موڑ کر ترجموں میں لگ جائیں۔ اس سلسلے میں انھوں نے جو جواز پیش کیا وہ یہ تھا کہ ہر فنکار ایک خاص مدت کے بعد خود کو دہرانے لگتا ہے چنانچہ اس پر قابو پانے کے لیے دیگر ادبیات کی جانب اس کا رجوع ہونا ضروری ہے۔" (4)

کسی بھی زبان کی ترقی ہے مطلب یہ ہو سکتا ہے کہ اس میں مقتضی کی خاطر چند نئے الفاظ کو وضع کیا جائے اور یہ جدید الفاظ اس زبان میں اس طرح سمو جائیں کہ قدیم اور جدید عنصر میں یک رنگی اور یکسانیت کا تاثر غالب آ جائے۔ ادب کی وسعت کا مفہوم تو یہ ہے کہ ہر صنف فن کو اردو زبان میں ڈھال دیا جائے۔ اس کے لیے دوسری زبانوں کی تالیف وتصنیفات کے تراجم کرنا اور خود اپنی زبان میں ان تمام اصناف پر کتابیں تحریر کی کرنا مقصود ہونا چاہیے۔

ادبی ترجمے میں مترجم کو اصل متن کے مفہوم کے ساتھ ساتھ اس کے اسلوب، لہجے، تاثر اور فنی خصوصیات کو بھی پیش نظر رکھنا پڑتا ہے۔ اس اعتبار سے مترجم لسانی رابطے کے توسط سے ایک تسلسل سے دو تہذیبوں اور ادبی روایات کے مابین فعال ذریعہ بن جاتا ہے۔ ترجمہ کی اہمیت کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اس کے ذریعہ سے مختلف زبانوں کے علمی و ادبی سرمائے تک رسائی ممکن ہو سکی۔ ایک زبان میں پیدا ہونے والے فکر و فن کو دوسری زبان کے قارئین تک پہنچا کر اور ان کی آرا کے ذریعے سے اپنے دائرہ کار میں وسعت لانے کا سبب بننا بھی اس کی اہمیت کو بڑھوتری دیتا ہے۔ چناں چہ تراجم نے انسانی تہذیب میں علوم و افکار کی ترسیل، ادبی تجربات کے تبادلے اور متفرق تہذیبوں کے باہمی ارتباط کے تعارف میں اہم کردار ادا کیا۔ اردو ادب بھی اس عمل سے یکساں مستفید ہوا اور مختلف زبانوں کے ادب کے استفادے سے اس کے موضوعات، اصناف، لفظیات اور اسالیب میں وسعت پیدا ہوتی چلی گئی۔

2۔ اردو ادب میں فن ترجمہ کی روایت: تاریخی پس منظر

اردو ترجمہ کاری کی کثیر جہتی داستان جس کے ابتدائی نقوش برصغیر کی تہذیبی فضا اور لسانی ہم آہنگی کے ایسے ماحول میں دیکھنے کو ملتے ہیں، جہاں مختلف زبانیں اور ثقافتیں باہم مل کر نئے پیمانوں میں جلوہ گر ہو رہی تھیں۔ ترجمہ کاری کی روایت میں دکنی دور قابل قدر اور قابل ذکر ہے۔ دکنی دور کے ابتدائی مترجمین نے مذہبی حکایات ،قصص الانبیاء نیز صوفیانہ روایات کو ایسے مقامی لب و لہجے میں رنگ دیا کہ یہ تحریریں صرف ترجمہ ہی نہ رہیں بلکہ ایک نئی تہذیبی روح کا عکاس بن گئیں۔ مغلیہ دور میں فارسی کی علمیت اور درباری و قار نے اردو زبان کو ترجمہ کاری کے لیے ایک نئی سمت عطا کی؛ فارسی داستانوں، رزمیہ نظموں اور اخلاقی نصوص کے تراجم نے اردو کے دامن میں ایسی وسعت پیدا کی جس نے اسے تخلیقی طور پر مزید مستحکم اور فکری طور پر زیادہ ہمہ گیر بنا دیا۔ بعد ازاں شاہ ولی اللہ اور ان کے خانوادے کے ہاتھوں قرآن مجید کے اردو تراجم نے نہ صرف اس زبان کو تقدس عطا کیا بلکہ اسے مذہبی علوم کی ترسیل کے لیے ایک معتبر اور قابل اعتماد ذریعہ بھی بنا دیا۔ جیسے کہ خلیق انجم اپنی تصنیف فن ترجمہ نگاری میں سترہویں صدی کے تراجم سے متعلق کچھ یوں رقمطراز ہیں:

"سترہویں صدی میں جن لوگوں نے اردو میں نثری اور شعری ادب کا آغاز کیا۔ ان کی علمی زبان فارسی تھی اسی لیے اردو کے ابتدائی شعری اور نثری سرمائے پر فارسی زبان وادب کا گہرا اثر ہے۔ یہ اثر تشبیہات و استعارات، تلمیحات، الفاظ اور فارسی کے اصناف سخن وغیرہ مستعار لینے تک ہی محدود نہیں رہا، بلکہ ہزاروں فارسی اشعار کا اردو میں ترجمہ بھی کیا گیا۔ "(5)

گویا سترہویں صدی کے انہی تراجم کو بنیاد بناتے ہوئے محترمہ ڈاکٹر فاخرہ نورین صاحبہ بھی اپنی تصنیف ترجمہ کاری میں فرماتی ہیں:

"سترھویں صدی میں سائنس کا عروج شروع ہوا اور قدیم مذہب اور جدید سائنس کی کشمکش نے لوگوں کے اذہان میں مخمصہ پیدا کر دیا۔ اس دور کی سیاست نے اس مخمصے کو مزید بڑھاوا دیا۔ فرانسیسی ادبی منظر نامے میں خصوصاً اور یورپی ادب میں عموماً کلاسیک ادب کا ترجمہ اور اسلوب کی نقل کا رجحان غالب تھا۔ یہ نقل اس دور میں غلامانہ روش نہیں بلکہ قابل فخر اور تخلیقی صلاحیتوں کو جلا بخشنے کا ایک اہم وسیلہ سمجھی جاتی تھی " (6)

تاہم اردو زبان میں ترجمہ کاری کے حقیقی اور منظم ادبی دور کا آغاز تب ہوا جب فورٹ ولیم کالج کی سرپرستی میں اردو نثر کو پہلی بار سلیقے، ترتیب اور فنی شعور کے ساتھ پروان چڑھنے کا موقع میسر آیا۔ میر امن دہلوی کی "باغ و بہار" اور دیگر معیاری تراجم جن کے مترجمین میں شیخ محمد بخش ناسخ، توتا رام، میر ابوالقاسم، ولیم ہنٹر، میر حسن، بہادر علی حسینی، کندن لال اور مظہر علی خاں والا کے تراجم نے اردو نثر میں وہ شگفتگی، روانی اور سلاست پیدا کر دی جو آج بھی اس کا سرمایہ افتخار سمجھی جاتی ہے۔ فورٹ ولیم کالج کے تراجم کی اہمیت خلیق انجم کی اس بات سے واضح ہوتی ہے کہ:

"اب تک اردو میں جتنے تراجم ہوئے تھے، وہ انفرادی کوششوں کا نتیجہ تھے۔ فورٹ ولیم کالج پہلا ادارہ تھا، جس نے منظم اور باقاعدہ طریقے پر عربی، فارسی اور سنسکرت سے اردو میں ترجمے کیے۔ "(7)

انیسویں اور بیسویں صدی کے بدلتے ہوئے سیاسی و سماجی منظر نامے نے اس روایت میں مزید رنگ بھر دیے، اب انگریزی اور دیگر یورپی زبانوں سے سائنس، فلسفے، تاریخ اور عالمی ادب کے ترجموں نے اردو کو بین الاقوامی فکری دھاروں سے منسلک کر دیا۔ یوں ترجمہ کاری کا یہ سفر محض الفاظ کے بدلنے کا عمل نہ رہا بلکہ تہذیبی مکالمے، عالمی توسیع اور ذہنی بالیدگی کا ایک درخشاں باب بن گیا۔ جو آج بھی اردو زبان کی شناخت میں کلیدی حیثیت رکھتا ہے۔ مرزا حامد بیگ نے ترجمہ کاری کی اسی کلیدی حیثیت کو اپنی تصنیف، ترجمہ کی روایت میں ان الفاظ میں واضح کیا کہ:

" ترجمے کا عمل دو زبانوں کے مابین پل بنانے کا کام کرتا ہے۔ جبکہ متن کا اس کی تمام اسلوبیاتی، موضوعی اور تکنیکی خصوصیات کے ساتھ کسی دوسری زبان میں منتقل ہو جانا ترجمے کا اصل گن ہے۔ "(8)

اردو زبان میں ترجمہ کاری کا تاریخی پس منظر اس خطے کی تہذیبی ہم آہنگی، سیاسی تغیر اور لسانی ارتقاء سے گہرا ربط رکھتا ہے۔ جس کا آغاز تو دکنی دور میں ہوا مگر بعد ازاں مغلیہ عہد میں اسے مزید تقویت ملی۔ اسی بابت ڈاکٹر فاخرہ نورین صاحبہ فرماتی ہیں:

"اٹھارویں صدی میں ہر مصنف شاعر اور ڈراما نگار نے ترجمے کو قابل توجہ سمجھا اور ایک تصنیف کے کئی کئی تراجم کیے گئے۔ اپنے پسندیدہ مصنفین کے اسلوب کی پیروی قابل فخر سمجھی جاتی تھی۔"(9)

گویا اردو زبان میں ترجمہ کاری کی روایت ایک ایسے تنوع آمیز سفر کی داستان ہے جس نے برصغیر کی تہذیبی روح، علم جستجو اور لسانی ارتقا کے سنگم پر جنم لیا۔ تراجم کی ابتدا دکن کے ان سادہ مگر پر اثر متون سے ہوئی جن میں مذہبی حکایات اور اخلاقی روایات کو مقامی لب و لہجے میں ڈھالنے کا باقاعدہ آغاز ہوا۔ اور یوں ترجمہ کاری کا یہ بیج پہلی بار اردو کی زرخیز زمین میں بویا گیا۔ اور بعد میں اسی بیج نے اردو زبان کے دامن کو نہ صرف نئی وسعتوں سے بھر ادیا، بلکہ اسے جدید فکری رجحانات سے بھی جوڑ دیا۔ یوں ترجمہ کاری نے اردو زبان و ادب کی تعمیر و ترقی سے لے کر اس کے تہذیبی فروغ تک کلیدی کردار ادا کیا۔

3۔ ترجمہ کے اسلوبی اور تخلیقی اثرات

ترجمہ میں ترجمہ کے اسلوبی اور تخلیقی اثرات پر بات کرنے سے قبل یہ جاننا ضروری ہے کہ اسلوب دراصل ہے کیا۔ اسلوب نہ تو خارجی شے ہے اور نہ اضافی، نہ ہی یہ کوئی آورد والا معاملہ ہے بلکہ اس کا تعلق انسانی ذہن میں جزو لاینفک کی طرح شروع ہی سے پایا جاتا ہے اور تقریباً ہر عمل میں اپنی کارکردگی دکھاتا رہتا ہے۔ اسی طرح یہ زبان کا بھی حصہ ہے جسے کسی صورت زبان سے الگ نہیں کیا جاسکتا۔ کسی بھی شاعر یا ادیب کے ہاں شروع میں زبان کی باریکیوں سے زیادہ شناسائی نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے ہاں اسلوب میں زیادہ جاذبیت اور نکھار و ندرت موجود نہیں ہوتی۔ اس حوالے سے ڈاکٹر سلیم آغا قزلباش کا یہ اظہار خیال غور طلب ہے:

"یہ (اسلوب) ایک ارتقائی عمل سے عبارت ہے جیسے جیسے تجربات مشاہدات اور مطالعے میں اضافہ ہوتا ہے اسلوب میں بھی اسی نسبت سے گہرائی نکھار اور جاذبیت در آتی ہے۔ ایک لحاظ سے اسلوب کا سفر سفر حیات سے مماثل ہے۔"(10)

معروف فرانسیسی مصنف بفون Buffon کے اس جملے کو سمجھنا بے حد ضروری ہے جس نے کافی زور پکڑے رکھا کہ " Style, c'estl homme meme." جس کا انگریزی ترجمہ " Style is the man himself" کیا گیا۔ یعنی اسلوب کے مطالعے سے ہم مصنف کی شخصیت کو جان لیتے ہیں۔ یا پھر اسلوب ہی ایسا راستہ ہے جو ہمیں کسی شخص کے مزاج، ذوق اور اس کے مشاہدے و تجربے کی خوبیوں و خامیوں سے ملوانے کا باعث بن جاتا ہے۔ گویا یہ کہا جاسکتا ہے اسلوب کے اندر مصنف کی شخصیت کے چند نقوش تو دریافت کیے جاسکتے ہیں مکمل مصنف یا ادیب کو دریافت کرنا بے حد مشکل ہے اسی بابت پروفیسر گوپی چند نارنگ کا بیان قابل توجہ ہے آپ فرماتے ہیں:

"دو پیرایہ بیان کی آزادی کا استعمال شعوری بھی ہوتا ہے اور غیر شعوری بھی، اس میں ذوق مزاج ذاتی پسند و ناپسند صنف یا ہئیت کے تقاضوں و قاری کی نوعیت کے تصور کو بھی دخل ہو سکتا ہے۔ یعنی تخلیقی اظہار کے جملہ امکانات جو وجود میں آچکے ہیں اور وہ جو وقوع پذیر ہو سکتے ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا (جس کا اختیار مصنف کو ہے) دراصل اسلوب ہے۔"(11)

اسلوب سے متعلق عصمت جاوید اپنی تصنیف عصمت کے مضمون جامع انتخاب میں لکھتے ہیں:

"اسلوب کو ادب کا شخصی پہلو اور اس کا ہئیتی عنصر قرار دیا جاتا ہے۔ اور یہ بات بڑی حد تک صحیح بھی ہے اس لیے اسلوب، ادیب یا شاعر کی ذاتی عطا ہے۔ جس طرح ہم ایک آنکھ اوجھل شخص کو اس کی آواز سے پہچان لیتے ہیں اسی طرح ایک ادبی فنکار اپنے مخصوص لہجے سے بآسانی شناخت کیا جاسکتا ہے۔ ہم کوئی شعر سن کر فوراً کہہ اٹھتے

میں کہ یہ اقبال کا رنگ ہے، اس شعر کو صرف غالب کہہ سکتا ہے. یہ میر کا انداز ہے، یہ سودا کا طمطراق ہے یہ مومن کی آواز ہے، یہ میر انیس کا آہنگ ہے لیکن آواز یا لہجے کی شناخت ہی اگر کسی ادبی فنکار کی عظمت کا واحد معیار قرار دیا جائے تو بڑی الجھنیں پیدا ہوں گی۔" (12)

اسلوبیاتی لحاظ سے سید عابد علی عابد علی اپنی تصنیف اسلوب میں رقم طراز ہیں:

"اسلوب سے مراد کسی لکھنے والے کی وہ انفرادی طرز نگارش ہے جس کی بنا پر وہ دوسرے لکھنے والوں سے ممیز ہو جاتا ہے۔" (13)

دونوں مترجمین کے تراجم میں اسلوبیاتی تقابل سے قبل اس بات کو ذہن میں رکھنا از حد ضروری ہے کہ دونوں مترجمین کے تراجم میں لگ بھگ پچھتر سال کا طویل دورانیے کے علاوہ ترجمہ کرنے کا انداز بھی یکسر جداگانہ ہے۔ سید عابد علی عابد کی اس رائے میں کوئی ابہام نہیں کہ طرز نگارش ہی لکھنے والوں کو ایک دوسرے سے ممتاز کرتا ہے۔

4۔ عمر خیام کے تراجم بطور مختصر مطالعاتی مثال

اردو زبان و ادب میں ترجمہ کاری کے تاریخی اور ارتقائی پس منظر کے بعد، اردو ادب میں عمر خیام کی رباعیات کے تراجم کا آغاز انیسویں صدی کے اوائل میں اس وقت ہوا جب برصغیر میں فارسی زبان کا علمی و ادبی غلبہ اپنے عروج پر تھا۔ عمر خیام کی رباعیات کے اردو تراجم کی اس کڑی کی کھوج میں، ڈاکٹر محمد تقی الدین احمد صاحب کی کہی گئی یہ بات گویا سند کا درجہ رکھتی ہے کہ:

" اردو کے لئے یہ بات بڑی سبکی کی تھی کہ اس میں رباعیوں کا کوئی قدیم ترجمہ نہیں تھا، دو تین ترجمے ہوئے بھی تو یہ بیسویں صدی کی اس علمی بیداری کا نتیجہ ہیں جو دوسری زبانوں کی ترقی کو دیکھ کر ہمارے ملک کے انشاپردازوں میں پیدا ہوئی، لیکن یہ خوشی کی بات ہے کہ اردو کبھی بھی اس باب میں پیچھے نہیں رہی بلکہ اسی پیاری زبان میں خیام کے ان جواہر پاروں کا ترجمہ کسی اور زبان میں ہونے سے قبل ہوا۔"(14)

شعر و ادب کے سنجیدہ قارئین فارسی کلاسیکی روایت سے گہری وابستگی تو رکھتے ہی تھے، اور رباعیات عمر خیام بھی اگرچہ اہل علم و ادب کے لیے اجنبی نہ تھیں مگر انھی رباعیات کو اردو قالب میں ڈھالنے کی جدوجہد کا منظم آغاز 1840 کے بعد تقریباً 1842ء میں ہوا۔ اس دور کے مترجمین میں سب سے نمایاں نام راجہ مکھن لال کا ہے۔ راجہ مکھن لال دربار "دکن" سے وابستہ تھے۔ عمر خیام کی رباعیات کا ترجمہ کرنا ان کا دوسرا بڑا علمی کارنامہ مانا جاتا ہے۔ بقول ان کے ان کی یہ دلی آرزو تھی کہ: " فارسی میں موجود رباعیات عمر خیام کا ترجمہ اردو ریختہ میں کیا جائے۔ جس کا آغاز خود ان کے دیباچہ رباعیات کے مطابق رجب 1260 میں ہوا۔"(15)

غالباً یہ علمی کارنامہ ان کے آخری وقت کی یادگار ہے کیونکہ غزل کے میدان میں ان کا شعری مزاج وہ جولانی نہیں دیکھا پایا۔ جس کی ان سے توقع تھی اس بابت وہ خود فرماتے ہیں:۔ " اوقات عزیز کو جانب مضمون گل و بلبل کے صرف نہ کیا۔"(16)

راجہ مکھن لال کی اس عمدہ کاوش کے سلسلے میں مولوی نصیر الدین صاحب ہاشمی کچھ یوں رقمطراز ہیں:

" راجہ مکھن لال نے 1260 میں عمر خیام کی رباعیات کا ترجمہ اردو رباعیات میں کیا، صاحب فن خیال کر سکتے ہیں کہ یہ کس قدر دشوار امر تھا مگر راجہ صاحب نے اس میدان کو طے کیا، اردو میں اسطرح کے سب سے پہلے مترجم یہی ہیں۔"(17)

اس سلسلے میں راجہ صاحب نے رجب 1260م بمطابق 1846ء میں ان رباعیات کو اردو قالب میں ڈھالنے کا باقاعدہ آغاز کیا۔ ان کا ترجمہ اگرچہ سادگی اور بے تکلفی کا آئینہ دار تھا۔ مگر اسی ترجمے سے اردو میں خیام شناسی کا پہلا دروا ہوا، اور ان رباعیات کی تفہیم کی پہلی روشن کرن نمودار ہوئی۔

حوالہ جات

1۔1Jakobson, Roman. "On Linguistic Aspects of Translation." *On Translation*, edited by Reuben Arthur Brower, Harvard University Press, 1959, pp. 232–239.

2۔فاخرہ نورین،ڈاکٹر، " ترجمہ کاری"، ادارہ تحقیقات اردو، اسلام آباد، سن اشاعت، 2014 ء، ص15

3۔۔ خلیق انجم، "فن ترجمہ نگاری مرتبہ"، ناشر: آفسٹ پریس، دہلی، سن اشاعت، 1996ء، ص134، 135

4۔حیات افتخار ڈاکٹر، "تقابلی ادبی مطالعہ"، ناشر: جے۔ایم۔پراسیس، چنئی، سن اشاعت، 2010ء، ص26، 27

5۔ خلیق انجم، "فن ترجمہ نگاری" ثمر آفسٹ پرنٹرز، نئی دلی، سن اشاعت، ستمبر 1996ء، ص11

6۔فاخرہ نورین،ڈاکٹر، " ترجمہ کاری"، ادارہ تحقیقات اردو، اسلام آباد، سن اشاعت ،2014، ء، ص77

7۔ خلیق انجم، "فن ترجمہ نگاری"، ثمر آفسٹ پرنٹرز، نئی دلی، سن اشاعت، ستمبر،1996ء، ص12

8۔مرزا حامد بیگ، " ترجمہ کی روایت"، دوست پبلیکیشنز، اسلام آباد، سن اشاعت 2016ء، ص22

9۔فاخرہ نورین،ڈاکٹر، "ترجمہ کاری"، ادارہ تحقیقات اردو، اسلام آباد، سن اشاعت، 2014 ء، ص77

10۔ سلیم آغا قزلباش، "جدید افسانے کے رجحانات"، ناشر:، سن اشاعت، نامعلوم، ص، 531

11۔ گوپی چند نارنگ پروفیسر، "ادبی تنقید اور اسلوبیات"، ناشر: ایجوکیشنل پبلشنگ ہاؤس، دہلی، سن اشاعت، 1989ء، ص، 15

12۔غضنفر اقبال، "عصمت جاوید، ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو، نئی دہلی، سن اشاعت، 2016ء ص، 74

13۔۔سید عابد علی عابد، "اسلوب، ناشر: علی گڑھ بک ڈپو، الہ آباد، سن اشاعت، 1976ء، ص44

14۔ محمد تقی الدین احمد، ڈاکٹر، "نذر خیام" ، اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار، حیدرآباد، سن اشاعت، 1958ء، ص19

15۔ محمد تقی الدین احمد، ڈاکٹر، " نذر خیام"، اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار، حیدرآباد، سن اشاعت، 1958ء، ص22

16۔ محمد تقی الدین احمد، ڈاکٹر، " نذر خیام"، اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار، حیدرآباد، سن اشاعت، 1958ء، ص22

17۔ محمد تقی الدین احمد، ڈاکٹر، " نذر خیام" ، اعجاز پرنٹنگ پریس چھتہ بازار، حیدرآباد، سن اشاعت، 1958ء، ص22